ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1903

Program:

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

Course: Tarikh-e-Islam-1 (1903) • Level: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

Assignment No. 1 (Units 1–4)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

Note: This guide is prepared for study and reference purposes. Students are advised to read the relevant units of the course book, understand the concepts, and then write the assignment in their own words.

نوٹ :یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے مفاہیم کو سمجھیں اور پھر امتحانی مشق اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

سوال نمبر :1 نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا کی سیاسی حالت پر بحث کریں۔

تعارف

کسی بھی عظیم انقلاب کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لیے اس دور کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے جس میں وہ انقلاب برپا ہوا۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت610 ء میں ہوئی، اور اس وقت دنیا کی سیاسی حالت انتہائی ابتر تھی۔ چھٹی صدی عیسوی کے اختتام اور ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کی بڑی طاقتیں باہمی جنگوں میں الجھی ہوئی تھیں، سلطنتیں ظلم و استبداد کا نمونہ بن چکی تھیں، عوام حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے اور دنیا میں کوئی ایسا عادلانہ نظام موجود نہ تھا جو انسان کو امن، انصاف اور وقار فراہم کر سکے۔ عرب، جہاں سے اسلام کا سورج طلوع

ہوا، سیاسی اعتبار سے منتشر قبائل کا مجموعہ تھا جن میں کوئی مرکزی حکومت موجود نہ تھی۔ اس سوال میں ہم بعثت سے قبل عرب، روم، فارس اور دیگر خطوں کی سیاسی حالت کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔

سیاسی حالت کا مطالعہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اسی پس منظر میں اسلام نے ایک ایسا عادلانہ سیاسی نظام پیش کیا جس نے چند ہی دہائیوں میں دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ اگر اس وقت کی دنیا امن و انصاف سے مالا مال ہوتی تو شاید نئی دعوت کی ضرورت اس شدت سے محسوس نہ ہوتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانیت ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی کسی نجات دہندہ کی منتظر تھی۔

جزیرہ نما عرب کی سیاسی حالت

بعثت سے قبل عرب کی سب سے بڑی سیاسی خصوصیت یہ تھی کہ پورے جزیرہ نما میں کوئی مرکزی حکومت موجود نہ تھی۔ عرب معاشرہ قبائل میں بٹا ہوا تھا اور ہر قبیلہ اپنے سردار کی سربراہی میں خود مختار زندگی گزارتا تھا۔ قبائلی عصبیت اتنی شدید تھی کہ فرد کی پوری وفاداری اپنے قبیلے تک محدود تھی، خواہ قبیلہ حق پر ہو یا باطل پر۔' اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم 'اس دور کا مشہور اصول تھا، جس نے انصاف کے بجائے اندھی حمایت کو رواج دیا۔

قبائل کے درمیان معمولی معمولی باتوں پر طویل جنگیں چلتی رہتی تھیں۔ حرب الفجار اور داحس و غبراء جیسی جنگیں اس کی واضح مثالیں ہیں، جن میں معمولی تنازعے نے کئی کئی سال تک انسانی جانوں کا ضیاع کیا۔ خون کا بدلہ خون کے اصول کی وجہ سے نسلیں دشمنی میں گزر جاتی تھیں اور امن کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ مکہ میں قریش کی ایک محدود سی انتظامی حیثیت ضرور تھی، دارالندوہ میں مشاورت ہوتی تھی اور سقایہ و رفادہ جیسے مناصب موجود تھے، لیکن یہ کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی بلکہ قبائلی روایات کا ایک ڈھانچا تھا۔

عرب کے سرحدی علاقے بڑی طاقتوں کے زیر اثر تھے۔ یمن پر پہلے حبشہ اور پھر فارس کا تسلط رہا، حیرہ کا علاقہ فارس کے تابع لخمی بادشاہوں کے تحت تھا اور شام کے غسانی عرب روم کے زیر سایہ تھے۔ اس طرح عرب سرزمین بڑی سلطنتوں کی رقابت کا میدان بنی ہوئی تھی اور عربوں کی اپنی کوئی متحد سیاسی قوت موجود نہ تھی۔ عورتوں اور کمزوروں کے حقوق کا کوئی تصور نہ تھا، طاقت ور کے لیے سب کچھ جائز تھا اور کمزور کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔

روم) بازنطینی (سلطنت کی سیاسی حالت

دنیا کی دوسری بڑی طاقت بازنطینی یا مشرقی روم کی سلطنت تھی جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا۔ یہ سلطنت اگرچہ وسعت و شان و شوکت میں بے مثال تھی لیکن اندرونی طور پر زوال کا شکار تھی۔ شہنشاہ مطلق العنان حکمران تھا، اس کی مرضی ہی قانون تھی اور رعایا پر بے تحاشا ٹیکسوں کا بوجھ تھا۔ درباری سازشیں، بادشاہوں کا قتل اور تخت کے لیے کشمکش عام تھی۔ چھٹی صدی کے اواخر اور ساتویں صدی کے اوائل میں روم اور فارس کی طویل جنگوں نے دونوں سلطنتوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔

رومی سلطنت میں مذہبی اختلافات نے بھی سیاسی انتشار کو بڑھا دیا تھا۔ عیسائی فرقوں کے درمیان شدید کشمکش تھی اور سرکاری مذہب کے مخالفین پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ مصر کے قبطیوں اور شام کے باشندوں پر حکومت کی جانب سے سختیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ یہ لوگ رومی حکومت سے بیزار ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب مسلمانوں کی عادلانہ حکومت کا پیغام ان علاقوں تک پہنچا تو مقامی باشندوں نے اسے نجات کا ذریعہ سمجھا۔

فارس) ساسانی (سلطنت کی سیاسی حالت

روم کے مقابلے میں دوسری عظیم طاقت فارس کی ساسانی سلطنت تھی جس کا دارالحکومت مدائن تھا۔ ساسانی بادشاہ خود کو خدا کا سایہ اور بعض اوقات خدائی صفات کا حامل سمجھتا تھا۔ معاشرہ سخت طبقاتی تقسیم کا شکار تھا : شاہی خاندان، مذہبی پیشوا، جنگجو سردار اور عام رعایا کے درمیان ناقابل عبور دیواریں کھڑی تھیں۔ عام آدمی بادشاہ کی زیارت تک کو نعمت سمجھتا تھا اور اسے حکمران کے سامنے بولنے کا حق حاصل نہ تھا۔

کسریٰ پرویز کے دور میں سلطنت کا ظاہری عروج اپنے نقطہ عروج پر تھا لیکن اسی دور میں روم سے جنگ نے خزانے خالی کر دیے اور عوام پر ظالمانہ محصولات عائد کیے گئے۔ پرویز کے بعد سلطنت تیزی سے زوال پذیر ہوئی؛ چند ہی سالوں میں تخت پر کئی بادشاہ اور ملکہ یکے بعد دیگرے آئے اور مرکزی اقتدار پارہ پارہ ہو گیا۔ امراء و سردار اپنی اپنی جاگیروں کے مالک بن بیٹھے اور رعایا کی حالت ناقابل بیان حد تک خراب ہو گئی۔ یہی سیاسی زوال بعد میں اس سلطنت کے تیزی سے خاتمے کا سبب بنا۔

دیگر خطوں کی سیاسی حالت :مصر، شام، حبشہ اور یمن

مصر اور شام اس وقت رومی سلطنت کے صوبے تھے اور ان پر گورنر حکومت کرتے تھے جو مقامی آبادی سے بھاری ٹیکس وصول کر کے قسطنطنیہ بھیجتے تھے۔ مقامی لوگ اپنی ہی سرزمین پر اجنبی تھے اور ان کی کوئی سیاسی حیثیت نہ تھی۔ حبشہ میں ایک عیسائی بادشاہت قائم تھی جہاں نجاشی جیسے انصاف پسند حکمران بھی ہوئے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مظلوم مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ وہاں ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔

یمن کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ یہ خطہ پہلے حمیری بادشاہوں کے تحت خوشحال تھا لیکن بعد میں حبشی تسلط اور پھر ایرانی قبضے نے اسے برباد کر دیا۔ ابرہہ کا لشکر اور پھر فارس کے گورنر باذان کا دور اس خطے کی سیاسی کمزوری کی دلیل ہے۔ ہندوستان اس دور میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور چین اگرچہ نسبتاً منظم تھا لیکن وہ بھی داخلی انتشار سے دوچار رہا۔ غرض دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہ تھا جہاں عوام کو حقیقی امن و انصاف میسر ہو۔

سیاسی بگاڑ کے اسباب اور اس کے نتائج

اس عالمی سیاسی بگاڑ کے چند بنیادی اسباب تھے۔ پہلا سبب مطلق العنانی تھا :حکمران خود کو ہر قانون سے بالاتر سمجھتے تھے۔ دوسرا سبب موروثی طبقاتی نظام تھا جس میں عام انسان کی کوئی قدر نہ تھی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ مذہب سیاست کی غلامی اختیار کر چکا تھا اور مذہبی رہنما حکمرانوں کے ضمیر کو روکنے کے بجائے ان کے آلہ کار بن گئے تھے۔ چوتھا سبب باہمی جنگوں کا تسلسل تھا جس نے معیشت اور معاشرت دونوں کو تباہ کر دیا تھا۔

ان اسباب کے نتائج یہ نکلے کہ عوام ذہنی طور پر کسی نئے نظام کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ انسانیت ایک ایسے نظام کی تلاش میں تھی جو حاکم و محکوم کے بجائے خالق و مخلوق کے رشتے کو بنیاد بنائے، جہاں قانون سب کے لیے برابر ہو اور جہاں حکمران بھی اسی قانون کے تابع ہو۔ اسلام نے بعثت کے بعد یہی سیاسی اصول دیے :خلافت و شوریٰ کا تصور، قانون کی بالادستی، حاکم کی جوابدہی اور رعایا کے حقوق کی ضمانت۔ مدینہ کی ریاست ان اصولوں کی پہلی عملی تصویر تھی۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا سیاسی اعتبار سے ظلم، استبداد، طبقاتی تقسیم اور انتشار کا شکار تھی۔ عرب قبائلی انتشار میں ڈوبا تھا، روم و فارس باہمی جنگوں سے کھوکھلے ہو چکے تھے، اور کہیں بھی عام انسان کو امن و انصاف حاصل نہ تھا۔ اس تاریک پس منظر میں اسلام نے ایک ایسا سیاسی و سماجی نظام پیش کیا جس کی بنیاد توحید، عدل اور انسانی مساوات پر تھی۔ چند عشروں کے اندر مدینہ کی چھوٹی سی ریاست نے دنیا کی دونوں بڑی سلطنتوں کے بالمقابل ایک عادلانہ متبادل پیش کر دیا۔ یہی وہ سیاسی پس منظر ہے جو سیرت النبی ﷺ کے مطالعے کو سمجھنے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

سوال نمبر 20) 2 نمبر(

سوال نمبر :2 سیرت کا مفہوم واضح کریں نیز سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ کی اہمیت پر نوٹ لکھیں۔

تعارف

سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ مسلمان کی دینی زندگی کا لازمی جز ہے، کیونکہ سیرت صرف تاریخی واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ قرآن مجید کی عملی تفسیر اور اسلامی تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی ذات کو اسوہ حسنہ قرار دیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کی زندگی کے ہر پہلو کو جاننا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اس سوال میں پہلے سیرت کے لغوی و اصطلاحی مفہوم کی وضاحت کی جائے گی، پھر مطالعہ سیرت کی اہمیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

سیرت کا لغوی مفہوم

لفظ' سیرت 'عربی زبان کے لفظ' سیر 'سے نکلا ہے، جس کے معنی چلنا، سفر کرنا اور روانہ ہونا ہے۔ لغت کی کتابوں میں سیرت کے معنی طریقہ، چال چلن، عادت، کردار، زندگی گزارنے کا انداز اور کسی شخص کی زندگی کے حالات بیان کے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا :

'سنعیدھا سیرتھا الاولیٰ 'یعنی ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت سے مراد کسی کی حالت، کیفیت اور طریق زندگی ہے۔

عربی ادب میں سیرت کا لفظ جنگی کارناموں اور بادشاہوں و نامور شخصیات کی زندگیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے، جیسے سیرت عنترہ اور سیرت سیف بن ذی یزن عوامی داستانوں کے طور پر مشہور ہوئیں۔ لیکن جب یہ لفظ مطلقاً 'السیرۃ 'کہا جائے تو مسلمانوں کے ہاں اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی مبارک زندگی ہی لی جاتی ہے، اور یہی اس لفظ کا سب سے شریف و مقدس استعمال ہے۔

سیرت کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاح میں سیرت سے مراد نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی کا جامع مطالعہ ہے، جو آپ ﷺ کی ولادت سے پہلے کے حالات سے لے کر آپ ﷺ کی وفات تک کے تمام واقعات، اقوال، افعال اور اخلاق کا احاطہ کرتا ہے۔ سیرت میں آپ ﷺ کی پیدائش، پرورش، بعثت، مکی زندگی، ہجرت، مدنی زندگی، غزوات و سرایا، معاہدات، خطوط و وفود، اخلاق و عادات اور آپ ﷺ کی دعوت کے تمام مراحل شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات اور اس دور کے معاشرتی پس منظر کا مطالعہ بھی سیرت کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

ابتدا میں سیرت کا علم' مغازی 'کے نام سے معروف تھا، جس میں زیادہ تر جنگی مہمات بیان ہوتی تھیں، لیکن بعد میں اس کا دائرہ وسیع ہو کر آپ ﷺ کی پوری زندگی کو شامل ہو گیا۔ ابن اسحاق) متوفی151 ھ (کو باقاعدہ سیرت نگاری کا بانی سمجھا جاتا ہے، جن کی سیرت کو ابن ہشام) متوفی218 ھ (نے مرتب کیا اور یہ آج بھی سیرت کا بنیادی ماخذ ہے۔ ان کے علاوہ واقدی، ابن سعد کی' الطبقات الکبریٰ 'اور طبری کی تاریخ بھی سیرت کے اہم ذخائر ہیں۔

سیرت اور تاریخ میں فرق

بظاہر سیرت اور تاریخ ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں لیکن دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ تاریخ عام واقعات اور بادشاہوں و قوموں کے عروج و زوال کا ریکارڈ ہے، جبکہ سیرت ایک ایسی ہستی کی زندگی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کے لیے نمونہ بنایا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ معلومات فراہم کرتا ہے لیکن سیرت کا مطالعہ کردار سازی کرتا ہے، ایمان کو تازگی

بخشتا ہے اور زندگی کا رخ متعین کرتا ہے۔ اسی لیے سیرت کے واقعات پر محققین نے نقد و تحقیق کی وہ کڑی محنت کی ہے جو دنیا کی کسی اور تاریخ پر نہیں ہوئی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ تاریخ میں مدح و ذم ہر دو پہلو ملتے ہیں، جبکہ سیرت نبوی کا ہر پہلو ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ مورخ واقعہ بیان کر کے گزر جاتا ہے، لیکن سیرت نگار واقعے سے اصول اخذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کا مطالعہ محض دلچسپی کا ذوق پورا نہیں کرتا بلکہ یہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے مسلمان اپنے دین کی عملی صورت سیکھتا ہے۔

مطالعہ سیرت النبی ﷺ کی اہمیت :دینی و ایمانی پہلو

مطالعہ سیرت کی سب سے بنیادی اہمیت دینی ہے۔ قرآن مجید کے احکام عام طور پر اصولی ہیں؛ نماز کا حکم قرآن میں ہے لیکن اس کا طریقہ سیرت و سنت سے معلوم ہوتا ہے، زکاۃ کی فرضیت قرآن میں ہے لیکن اس کا نصاب سیرت سے ملتا ہے، حج کے احکام بھی عملی صورت میں سیرت ہی سے واضح ہوتے ہیں۔ یوں سیرت کو سمجھے بغیر قرآن کی عملی تعمیل ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رسول ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے) سورۃ الاحزاب(21 :، لہٰذا اس نمونے سے واقفیت ایمان کا تقاضا ہے۔

سیرت کا مطالعہ محبت رسول ﷺ کا ذریعہ بھی ہے۔ جس ہستی کی زندگی کے واقعات انسان بار بار پڑھتا ہے، اس سے اس کی محبت بڑھتی ہے اور محبت ہی ایمان کی اصل روح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جنگوں کی شدت میں حضور ﷺ کے قریب ہو کر پناہ لیتے تھے، ایسے بے شمار واقعات سیرت میں پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے اور دل میں ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سیرت سے دعوت دین کے مراحل، حکمت عملی اور مختلف طبقات سے برتاؤ کے اصول معلوم ہوتے ہیں، جو ہر داعی اور مبلغ کے لیے ناگزیر ہیں۔

مطالعہ سیرت کی اخلاقی و عملی اہمیت

سیرت اخلاق کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا' :کان خلقه القرآن 'یعنی آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا۔ سچائی، امانت، صبر، شجاعت، سخاوت، عفو و درگزر، عدل و انصاف اور رحم دلی جیسی تمام اعلیٰ صفات کی عملی مثالیں سیرت میں موجود ہیں۔ ایک تاجر سیرت پڑھ کر

دیانت دار تجارت سیکھتا ہے، ایک حکمران عدل و انصاف سیکھتا ہے، ایک سپاہی جنگ کے آداب سیکھتا ہے اور ایک عام انسان اپنے گھر والوں، پڑوسیوں اور معاشرے کے ساتھ حسن سلوک سیکھتا ہے۔

موجودہ دور میں مطالعہ سیرت کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ معاشرہ اخلاقی زوال، ذہنی انتشار اور فکری گمراہی کا شکار ہے، نوجوان نسل کو ایسے آئیڈیل کی تلاش ہے جس کی پیروی کی جا سکے۔ ایسے میں سیرت النبی ﷺ سب سے مکمل اور محفوظ رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ نیز اسلام کے بارے میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کا سب سے مؤثر جواب حضور ﷺ کی اصل زندگی پیش کرنا ہے، کیونکہ جس نے بھی غیر جانبداری سے سیرت کا مطالعہ کیا، وہ آپ ﷺ کی عظمت کا قائل ہوا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی، تعلیمی اداروں اور تربیت اولاد میں بھی سیرت بنیادی نصاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

حاصل کلام یہ ہے کہ سیرت سے مراد نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی کا جامع اور مستند مطالعہ ہے، جو اسلام کی عملی تصویر پیش کرتا ہے۔ مطالعہ سیرت دینی اعتبار سے ضروری، اخلاقی اعتبار سے کردار ساز، دعوتی اعتبار سے رہنما اور علمی اعتبار سے تاریخ کا سب سے محفوظ باب ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ مستند کتب سیرت کا باقاعدہ مطالعہ کرے، اسے اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کرے اور اولاد کی تربیت میں سیرت کو بنیاد بنائے، کیونکہ یہی ذات گرامی تک پہنچنے والے اللہ کے احکام کی عملی شرح اور اسوہ حسنہ ہے۔

سوال نمبر 20) 3 نمبر(

سوال نمبر :3 جامع نوٹ لکھیں (1) :حرب الفجار (2) ہجرت حبشہ

تعارف

اس سوال میں دو اہم واقعات پر جامع نوٹ مطلوب ہے۔ حرب الفجار بعثت سے پہلے عرب کے قبائلی دور کی مشہور جنگ ہے جس میں حضور ﷺ نے نوجوانی میں شرکت فرمائی، جبکہ ہجرت حبشہ مکی دور میں مسلمانوں کی پہلی

ہجرت ہے جو دعوت اسلامی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں واقعات الگ الگ ادوار سے تعلق رکھتے ہیں لیکن دونوں سیرت النبی ﷺ کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہیں۔

حصہ اول :حرب الفجار — پس منظر و اسباب

حرب الفجار عرب کی ان مشہور جنگوں میں سے ہے جو قریش و بنو کنانہ اور قبیلہ قیس عیلان) بنو ہوازن وغیرہ (کے درمیان لڑی گئی۔ اسے' فجار 'اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ اشہر حرم) ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب (میں لڑی گئی، جن مہینوں میں جنگ و قتال عرب روایات کے مطابق حرام تھا۔ اس حرمت کی پامالی کو عربی میں فجور کہتے ہیں، اسی مناسبت سے اس جنگ کا نام حرب الفجار پڑ گیا۔ یہ جنگ دراصل عربوں کے اس سیاسی و سماجی انتشار کی علامت ہے جس کا ذکر پچھلے مباحث میں آ چکا ہے۔

اس جنگ کا فوری سبب روایات میں ایک تجارتی قافلے اور برآض بن قیس نامی شخص کے ایک قتل سے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ لخمی بادشاہ نعمان بن منذر کے تجارتی قافلے کی حفاظت کے مسئلے پر تنازع ہوا، برآض نے عروہ الرحال کو قتل کر دیا، جس پر قبیلہ قیس نے بدلہ لینے کی ٹھانی اور مکہ کے بازار عکاظ کے قریب جنگ چھڑ گئی۔ اس طرح ایک معمولی واقعے نے دو بڑے قبائلی اتحادوں کو کئی سال تک میدان جنگ میں کھڑا کر دیا۔

حرب الفجار کے واقعات اور حضور ﷺ کی شرکت

یہ جنگ وقفے وقفے سے کئی سال جاری رہی اور اس میں کئی معرکے ہوئے، جن میں یوم نخلہ، یوم شمطہ اور یوم عکاظ مشہور ہیں۔ اختتام پر قبائل کے سمجھ دار لوگوں کی کوششوں سے صلح ہو گئی اور مقتولین کی دیت کی ادائیگی پر اتفاق ہوا، کیونکہ دونوں فریق مسلسل خونریزی سے تنگ آ چکے تھے۔ یہ انجام اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب سماج میں عقل و انصاف پسند عناصر بھی موجود تھے جو انتشار سے نجات چاہتے تھے۔

اس جنگ کے وقت حضور ﷺ کی عمر مبارک مختلف روایات کے مطابق چودہ، پندرہ یا بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ ﷺ نے اس جنگ میں براہ راست قتال نہیں فرمایا بلکہ اپنے چچاؤں کو تیر اٹھا کر دینے اور ان کے سامان کی حفاظت جیسی خدمات انجام دیں۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق آپ ﷺ دشمن کے تیروں سے اپنے چچاؤں کی ڈھال کا کام بھی کرتے

تھے۔ اس شرکت سے آپ ﷺ کو قبائلی نظام، جنگ و امن کے اسباب اور عرب معاشرے کی کمزوریوں کا عملی مشاہدہ حاصل ہوا، جو بعد میں آپ ﷺ کی دعوت و اصلاح کی حکمت عملی میں معاون ثابت ہوا۔

حرب الفجار کے نتائج و اثرات

حرب الفجار کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کے باشعور لوگوں کو ظلم کے خلاف مشترکہ نظام کی ضرورت کا احساس ہوا۔ یہی پس منظر ہے جس میں کچھ عرصہ بعد 'حلف الفضول' کا مشہور معاہدہ ہوا، جس میں کئی قبائل نے عہد کیا کہ مکہ میں کسی مظلوم کی، خواہ وہ مقامی ہو یا اجنبی، مدد کی جائے گی۔ حضور ﷺ اس معاہدے میں شریک تھے اور بعثت کے بعد بھی فرماتے تھے کہ اگر آج بھی مجھے اس معاہدے کی طرف بلایا جائے تو میں قبول کروں گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ظلم کے خاتمے کے لیے کی جانے والی ہر مثبت کوشش کی تائید کی۔

دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کی تباہ کاریوں نے قبائل کو باہمی اتحاد کی اہمیت کا احساس دلایا۔ تیسرا، اس دور کے تجربات نے حضور ﷺ کو عرب نفسیات، قبائلی عصبیت اور اس کے توڑنے کی تدابیر سے روشناس کیا۔ حرب الفجار سیرت کے مطالعے میں اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ بعثت سے قبل عرب معاشرے کی اس تصویر کو واضح کرتی ہے جس کی اصلاح کے لیے اسلام آیا تھا۔

حصہ دوم :ہجرت حبشہ — پس منظر

بعثت کے بعد مکہ میں مسلمانوں پر قریش کے مظالم بڑھتے گئے۔ کمزور مسلمانوں پر تشدد کیا جاتا، انہیں دعوت سے باز رکھنے کے لیے ہر حربہ استعمال ہوتا۔ جب پانچ نبوی میں مظالم ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئے تو حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی اور فرمایا کہ وہاں ایک ایسا بادشاہ) نجاشی اصحمہ (حکمران ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا، اور وہ سچائی کی سرزمین ہے، یہاں تک کہ اللہ تمہارے لیے کشائش پیدا کرے۔ اس ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مظلوموں کے تحفظ اور دعوت کے محفوظ ماحول کی تلاش میں کس قدر دور اندیش تھے۔

پہلی اور دوسری ہجرت حبشہ

پہلی ہجرت میں گیارہ مرد اور چار عورتیں شامل تھیں، جن میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ بھی تھیں۔ یہ قافلہ رات کے اندھیرے میں مکہ سے نکل کر بحیرہ احمر کے راستے حبشہ پہنچا اور وہاں امن سے رہنے لگا۔ کچھ عرصے بعد یہ افواہ پھیلی کہ مکہ والے مسلمان ہو گئے ہیں، جس پر کچھ مہاجرین واپس آ گئے، لیکن افواہ غلط ثابت ہونے پر مظالم پہلے سے بڑھ گئے اور دوسری بڑی ہجرت واقع ہوئی۔

دوسری ہجرت میں تراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں شامل تھیں اور اس کی قیادت حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے۔ قریش نے اس بار مہاجرین کی واپسی کے لیے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو قیمتی تحائف کے ساتھ نجاشی کے دربار میں بھیجا۔ نجاشی نے انصاف سے کام لیا اور دونوں فریقوں کو سننے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے وہ تاریخی خطبہ دیا جس میں عرب کی جاہلی جہالت، اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں پر قریش کے مظالم کی مکمل تصویر پیش کی اور سورۃ مریم کی آیات تلاوت کیں، جنہیں سن کر نجاشی اور اس کے دربار کے علما رو پڑے۔

نجاشی نے قریش کے سفیروں کے تحائف واپس کر دیے اور مسلمانوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا۔ اگلے دن عمرو بن العاص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ پوچھ کر فتنہ کھڑا کرنے کی کوشش کی، لیکن حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے واضح اور مدلل جواب پر نجاشی نے زمین سے تنکا اٹھا کر کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے ذرا بھی برتر نہیں جو تم نے کہا ہے، اور مسلمانوں کو اطمینان سے رہنے کی اجازت دی۔ یوں ہجرت حبشہ کامیاب ثابت ہوئی اور مسلمان کئی سال وہاں امن سے رہے۔

ہجرت حبشہ کے نتائج و اہمیت

ہجرت حبشہ کے کئی اہم نتائج نکلے۔ اول، مظلوم مسلمانوں کو ایک محفوظ پناہ گاہ مل گئی اور قریش کی یہ پالیسی ناکام ہو گئی کہ مظالم سے دعوت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ دوم، اسلام کا پیغام پہلی مرتبہ جزیرہ نما عرب سے باہر ایک اور ملک تک پہنچا اور نجاشی جیسے انصاف پسند حکمران نے اسلام کی سچائی کی گواہی دی۔ سوم، یہ واقعہ 'دارالکفر

سے دارالامن کی طرف ہجرت ' کے اصول کی پہلی عملی مثال بنا جس کی بڑی صورت بعد میں ہجرت مدینہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

چہارم، اس ہجرت نے مسلمانوں کو صبر، تنظیم اور بین الاقوامی سفارت کاری کا تجربہ دیا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا خطبہ دعوت کے اصولوں کا نمونہ ہے کہ مخالف ماحول میں سچائی کس حکمت اور جرأت سے پیش کی جاتی ہے۔ آخر میں یہ بھی قابل غور ہے کہ یہ مہاجرین خیبر کے بعد تک مدینہ واپس آتے رہے اور انہیں' ذوالہجرتین 'کا شرف حاصل ہوا، جنہوں نے دین کی خاطر دو مرتبہ وطن چھوڑا۔

خلاصہ و نتیجہ

حاصل یہ ہے کہ حرب الفجار بعثت سے قبل قبائلی انتشار اور اس کے خلاف پیدا ہونے والے اصلاحی شعور کی علامت ہے، جبکہ ہجرت حبشہ مظلوم مسلمانوں کی حفاظت، دعوت کی وسعت اور انصاف پسند حکمران کی سچائی شناسی کا درخشاں باب ہے۔ دونوں واقعات سیرت کی تاریخ میں اس تدریج کو ظاہر کرتے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت کو مکہ کی گلیوں سے نکال کر عالمی سطح تک پہنچایا۔

سوال نمبر 20) 4 نمبر(

سوال نمبر :4 نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ میں سے ایفائے عہد کی وضاحت کریں۔

تعارف

نبی کریم ﷺ کے اخلاق کریمانہ کا ہر پہلو انسانیت کے لیے نمونہ ہے، اور ان میں ایفائے عہد یعنی وعدہ پورا کرنا اور معاہدوں کی پاسداری ایک نمایاں صفت ہے۔ عہد کی پابندی کسی بھی معاشرے کے اعتماد کی بنیاد ہوتی ہے۔ جاہلی عرب معاشرے میں وعدہ خلافی عام تھی اور عہد کو وقتی مفاد کے تابع سمجھا جاتا تھا، لیکن حضور ﷺ نے بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک ایفائے عہد کی وہ مثالیں قائم کیں جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس جواب میں پہلے ایفائے عہد کا مفہوم اور قرآن و حدیث کی تعلیمات، پھر حضور ﷺ کی زندگی سے اس کی عملی مثالیں اور آخر میں اس کے اسباق بیان کیے جائیں گے۔

ایفائے عہد کا مفہوم اور دینی حیثیت

عہد کے معنی کسی بات کا پکا ارادہ و پیمان کرنا ہے، اور ایفائے عہد سے مراد اس وعدے اور معاہدے کو پورا کرنا ہے جو انسان اللہ سے، اپنے آپ سے یا دوسرے انسانوں سے کرے۔ قرآن مجید نے ایفائے عہد کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے : 'والموفون بعهدهم اذا عاهدوا) 'سورۃ البقرۃ (177 :کہ نیکی یہ ہے کہ لوگ جب عہد کریں تو اسے پورا کریں۔ سورۃ المؤمنون میں کامیاب مومنوں کی صفات میں امانتوں اور عہد کی رعایت کو شمار کیا گیا ہے، اور سورۃ الاسراء میں حکم ہے کہ عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

حدیث نبوی میں وعدہ خلافی کو منافقت کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں : جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلافی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایفائے عہد صرف اخلاقی خوبی نہیں بلکہ ایمان کا جزو ہے اور وعدہ خلافی ایمان کے منافی عمل ہے۔ حضور ﷺ کی پوری زندگی اسی اصول کی عملی تفسیر تھی۔

بعثت سے قبل ایفائے عہد کی مثالیں

بعثت سے پہلے بھی حضور ﷺ کی ایمانداری اور وعدے کی پابندی مکہ میں ضرب المثل تھی، اسی لیے آپ ﷺ کو' الصادق الامین 'کہا جاتا تھا۔ ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آپ ﷺ سے ایک جگہ ملنے کا وعدہ کیا اور خود بھول کر تین دن بعد آیا تو آپ ﷺ کو اسی جگہ منتظر پایا، آپ ﷺ نے ناراضگی کے بجائے نرمی سے فرمایا کہ تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا، میں تین دن سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ یہ واقعہ دکھاتا ہے کہ آپ ﷺ کے ہاں وعدے کی پاسداری وقتی مزاج نہیں بلکہ فطرت کا حصہ تھی۔

حلف الفضول میں شرکت اور اس کی تائید بھی ایفائے عہد ہی کا مظہر تھی۔ یہ معاہدہ مظلوم کی مدد کے لیے ہوا تھا اور آپ ﷺ نے اسلام کے بعد بھی اس سے اپنی وابستگی کا اظہار فرمایا۔ اسی طرح جب عرب کے ایک شخص نے اپنا حق مانگا اور ابوجہل کے رویے کے خلاف قریش نے حضور ﷺ کی طرف اشارہ بطور مذاق کیا تو آپ ﷺ نے فی الفور اس مظلوم کا حق ابوجہل سے دلوا دیا۔ یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ اسلام سے پہلے بھی آپ ﷺ کا کردار عہد و انصاف کی غیر معمولی پابندی پر قائم تھا۔

مکی و مدنی دور میں معاہدوں کی پاسداری

مدنی دور میں ایفائے عہد کی سب سے بڑی مثال صلح حدیبیہ ہے۔ یہ معاہدہ بظاہر مسلمانوں کے لیے سخت شرائط پر مشتمل تھا، لیکن آپ ﷺ نے اسے مکمل طور پر قبول کیا اور اس کی ہر شرط کی پاسداری فرمائی۔ جب حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے حدیبیہ پہنچے اور مسلمانوں سے پناہ کی فریاد کی تو معاہدے کی رو سے آپ ﷺ نے نہایت دکھ کے ساتھ انہیں واپس کیا اور فرمایا کہ اے ابو جندل !صبر کرو، اللہ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ کمزوروں کے لیے کشائش پیدا کرے گا، ہم نے قوم سے عہد کر لیا ہے، ہم عہد کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ یہ انسانیت کی تاریخ میں ایفائے عہد کی عظیم ترین مثالوں میں سے ایک ہے۔

اسی طرح حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے معاملے میں بھی آپ ﷺ نے معاہدے کی پاسداری کی، یہاں تک کہ قریش خود اس شرط سے تنگ آ کر اسے ختم کرنے پر مجبور ہوئے۔ بنو بکر اور خزاعہ کے تنازعے میں جب قریش نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو بکر کی مدد کی تو یہی عہد شکنی فتح مکہ کا سبب بنی، اور مسلمانوں کا مؤقف دنیا بھر میں یہی رہا کہ جنگ کی ابتدا عہد توڑنے والوں کی طرف سے ہوئی۔ نجاشی، مقوقس اور دیگر حکمرانوں کے ساتھ خطوط و معاہدات میں بھی آپ ﷺ نے ہر وعدے کو پورا فرمایا۔

یہودی قبائل کے ساتھ مدینہ کے میثاق) میثاق مدینہ (میں بھی آپ ﷺ نے تمام شرائط کی پابندی رکھی، اور جب بھی ان قبائل سے الگ ہونا پڑا تو اس کا سبب انہی کی عہد شکنی اور غداری تھی، مسلمانوں کی طرف سے کبھی معاہدے کی پہلی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ نیز فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان بھی اس وعدے کی تکمیل تھی جو آپ ﷺ نے مکہ سے نکلتے وقت اپنے دل میں کیا تھا کہ عدل و رحم سے کام لیا جائے گا۔ حتیٰ کہ اپنے شدید ترین دشمنوں سے کیے گئے وعدے بھی پورے کیے گئے، اور یہی وجہ ہے کہ دوست و دشمن سب آپ ﷺ کے قول کو حرف آخر سمجھتے تھے۔

ایفائے عہد کے معاشرتی اثرات

ایفائے عہد کی اس عملی تعلیم نے اسلامی معاشرے کی بنیاد اعتماد پر رکھی۔ جب حکمران اور قائد اپنے وعدے کا پابند ہو تو پورا معاشرہ امن و اعتماد کا گہوارہ بن جاتا ہے؛ تجارت پھلتی پھولتی ہے، تعلقات مضبوط ہوتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر ریاست کی ساکھ قائم رہتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کے معاہدے کی پاسداری ہی وہ سبب تھی کہ

مفتوحہ اقوام مسلمانوں کی حکومت کو دوسروں پر ترجیح دیتی تھیں، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ مسلمان عہد نہیں توڑتے۔

آج کے دور میں اس صفت کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ افراد سے لے کر ریاستوں تک وعدہ خلافی عام ہو چکی ہے؛ ذاتی تعلقات میں بے اعتمادی، کاروبار میں دھوکا اور عالمی سیاست میں معاہدوں کی پامالی روز کا معمول ہے۔ مسلمان طالب علم کے لیے ایفائے عہد کا سبق یہ ہے کہ وہ وقت کی پابندی کرے، اپنے وعدوں کو نبھائے، معاہدوں کی شرائط پوری کرے اور اپنے قول کو اپنی عزت سمجھے۔ یہی حضور ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی پیروی کا حقیقی ثمر ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ ایفائے عہد حضور ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی نہایت درخشاں صفت تھی، جس کی مثالیں آپ ﷺ کی زندگی کے ہر دور میں بکثرت ملتی ہیں :عبداللہ بن ابی الحمساء کے انتظار سے لے کر حلف الفضول کی تائید تک، اور حدیبیہ کے سخت معاہدے کی مکمل پاسداری سے لے کر ابو جندل رضی اللہ عنہ کی واپسی تک۔ قرآن و حدیث نے اس صفت کو ایمان کی علامت اور اس کی خلاف ورزی کو نفاق کی نشانی قرار دیا ہے۔ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اسوہ حسنہ کی اس صفت کو اپنی زندگی میں اختیار کرے، کیونکہ معاشرے کا اعتماد اور فرد کی عزت اسی صفت پر قائم ہے۔

سوال نمبر 20) 5 نمبر(

سوال نمبر :5 حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے نمایاں پہلو واضح کریں۔

تعارف

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور خلافت11) ھ تا13 ھ632 / ء تا634 ء (اسلامی تاریخ کا مختصر ترین مگر نہایت فیصلہ کن دور ہے۔ یہ دور محض ڈھائی سال پر محیط ہے، لیکن اس میں وہ کارنامے انجام پائے جنہوں نے اسلامی ریاست کو اندرونی انتشار سے بچایا، اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اسے عالمی قوت بننے کی راہ پر ڈال دیا۔ حضور

ﷺ کی وفات کے فوراً بعد پیدا ہونے والے بحرانوں کے مقابلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ثابت قدمی، دور اندیشی اور ایمانی جرأت مثالی ہے۔ اس جواب میں آپ رضی اللہ عنہ کے دور کے نمایاں پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔

انتخاب خلافت اور سقیفہ بنی ساعدہ کا فیصلہ

حضور ﷺ کی وفات کی خبر پھیلتے ہی مدینہ میں سخت اضطراب پھیل گیا۔ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے پر غور کرنے لگے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما وہاں پہنچے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت حکمت سے استدلال کیا، قریش کی فضیلت اور عرب قبائل کی نفسیات بیان کی اور مشورہ دیا کہ خلیفہ قریش میں سے ہو جبکہ وزارت اور مشاورت میں انصار شریک رہیں۔ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اگلے دن مسجد نبوی میں عام بیعت ہوئی۔

آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں حکومت کا وہ اصول بیان کیا جو اسلامی سیاست کی بنیاد ہے۔ فرمایا :اے لوگو ! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تم میں سے بہتر نہیں؛ اگر میں ٹھیک کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلطی کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو میری اطاعت فرض ہے اور اگر میں ان کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت نہیں۔ یہ خطبہ جوابدہ حکومت کا پہلا منشور تھا، جس نے حکمران کو قانون سے بالاتر ہونے کے اس دور میں ایک نئی سیاسی اخلاقیات قائم کر دی۔

فتنہ ارتداد کا مقابلہ اور جیش اسامہ کی روانگی

حضور ﷺ کی وفات کے بعد جزیرہ نما عرب میں ارتداد کی لہر اٹھی۔ بہت سے قبائل نے اسلام سے بغاوت کر دی، کچھ نے زکاۃ دینے سے انکار کیا اور کچھ جھوٹے مدعیان نبوت کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نازک وقت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کرنے کا فیصلہ کیا، حالانکہ خطرات کے پیش نظر بعض صحابہ لشکر کو مدینہ کی حفاظت کے لیے روکنے کے حق میں تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس لشکر کو رسول اللہ ﷺ نے روانہ کیا ہو میں اسے نہیں روک سکتا۔ اس فیصلے نے دنیا کو بتا دیا کہ مدینہ کمزور نہیں اور اسلامی ریاست کا وقار برقرار ہے۔

مانعین زکاۃ کے بارے میں بھی آپ رضی اللہ عنہ کا مؤقف تاریخ ساز تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت بعض صحابہ نرمی کے قائل تھے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا :اللہ کی قسم !جو شخص نماز اور زکاۃ میں فرق کرے گا میں اس سے ضرور جنگ کروں گا، اگر یہ لوگ وہ رسی بھی روکیں گے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے لڑوں گا۔ اس اصولی ثابت قدمی نے ریاست کے اقتصادی و دینی نظام کو بکھرنے سے بچا لیا اور بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعتراف کیا کہ اللہ نے ابوبکر کے سینے کو اسی فیصلے کے لیے کھولا تھا۔

جھوٹے مدعیان نبوت کا خاتمہ اور عرب کا اتحاد

اس دور کا تیسرا بڑا چیلنج جھوٹے مدعیان نبوت تھے :یمامہ کا مسیلمہ کذاب، یمن کا اسود عنسی، نجد کا طلیحہ اسدی اور سجاح کاذبہ۔ یہ مدعیان قبائلی عصبیت کو ابھار کر بڑی بڑی فوجیں جمع کر چکے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مختلف محاذوں پر گیارہ لشکر ترتیب دیے اور ہر محاذ کے لیے موزوں امیر مقرر کیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پہلے طلیحہ کو بزاخہ میں اور پھر مسیلمہ کو یمامہ کی فیصلہ کن جنگ) جنگ عقرباء (میں شکست دی، جس میں سات سو سے زائد حفاظ صحابہ شہید ہوئے۔

ان مہمات کے نتیجے میں پورا جزیرہ نما عرب پہلی مرتبہ ایک مرکزی حکومت کے تحت متحد ہو گیا۔ یہ اتحاد ہی وہ بنیاد تھی جس پر بعد میں عالمی فتوحات کی عمارت کھڑی ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ممالک مفتوحہ کے انتظامی امور میں مقامی روایات سے فائدہ اٹھایا اور قبائل کو منظم کر کے ریاستی ڈھانچے میں ضم کر دیا۔ یہ ان کی سیاسی بصیرت کا واضح ثبوت ہے کہ وہ جنگ کے ساتھ ساتھ تعمیر ریاست کے ماہر بھی تھے۔

عراق و شام کی فتوحات کا آغاز

عرب کے اتحاد کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی ریاست کی توسیع باہر کی طرف شروع کی، تاکہ سرحدوں سے ملحقہ وہ قوتیں جو عرب مرتدین کی مدد کر رہی تھیں، ان کا خطرہ ختم ہو۔ عراق کی مہم حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی، جنہوں نے حیرہ وغیرہ فتح کر کے فرات کے مغربی کنارے تک اسلامی حکومت قائم کر دی۔ شام کی طرف چار لشکر روانہ کیے گئے جن کے امراء حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، یزید بن ابی سفیان، شرحبیل بن حسنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ کی ہدایات فوجی اخلاقیات کا نمونہ تھیں :بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور راہبوں کو قتل نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، فصلیں نہ اجاڑنا اور عہد نہ توڑنا۔ یہ ہدایات آپ نے حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو روانگی کے وقت دیں اور یہ آج بھی جنگی قوانین کی تاریخ میں ایک درخشاں باب ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے دور کے اختتام پر شام میں جنگ یرموک کی تیاری جاری تھی اور آپ کی وفات کے چند دن بعد یہ معرکہ مسلمانوں کی عظیم فتح پر منتج ہوا۔

جمع قرآن اور انتظامی خصوصیات

جنگ یمامہ میں حفاظ قرآن کی بکثرت شہادت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تشویش میں مبتلا کیا اور انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کی تجویز پیش کی۔ ابتدا میں تردد کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں یہ عظیم کام سرانجام دیا۔ سخت احتیاط کے ساتھ تحریری صحائف اور حفاظ کے سینوں سے قرآن کو ایک مصحف کی صورت میں جمع کیا گیا، جو پہلے حضرت ابوبکر، پھر حضرت عمر اور پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہم کے پاس محفوظ رہا اور بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف امام کی بنیاد بنا۔ یہ امت کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا احسان ہے۔

انتظامی اعتبار سے آپ رضی اللہ عنہ کا دور سادگی، عدل اور دیانت کا نمونہ تھا۔ آپ نے اپنا پورا مال اسلام کی راہ میں پہلے ہی خرچ کر دیا تھا، خلافت کے بعد بیت المال سے صرف ضرورت بھر وظیفہ لیا اور وفات سے قبل ہدایت کی کہ جو کچھ لیا ہے اس کا حساب لگا کر واپس کیا جائے۔ قضا کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کتابت کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور مختلف علاقوں کے عمال کی تقرری سے انتظامی نظام باقاعدہ چل رہا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی عہدے کو امانت سمجھنے کی اعلیٰ مثال ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے نمایاں پہلو یہ ہیں :بروقت اور پُرامن انتخاب خلافت، جوابدہ حکومت کے اصول کا اعلان، ارتداد و مانعین زکاۃ کے فتنوں کا اصولی خاتمہ، جھوٹے مدعیان نبوت کی سرکوبی، جزیرہ نما عرب کا اتحاد، عراق و شام کی فتوحات کا آغاز اور جمع قرآن جیسا عظیم علمی و دینی کارنامہ۔ ڈھائی

سال کا یہ مختصر دور گواہ ہے کہ صحیح قیادت، اصول پسندی اور اللہ پر توکل ہو تو بڑے سے بڑا بحران بھی قوم کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کو امت کا محسن اور خلیفہ راشد اول کا درجہ حاصل ہے۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com